چند اعتراضات اور اُن کے جوابات

(ابوالاعلیٰ مودودی)

ایک صاحب نے ایک طویل مکتوب کی شکل میں مدیرؔ ترجمان ؔ کی بعض تحریروں پر اعتراضات وارد کیے تھے۔ مدیرؔ ترجمانؔ نے ان کا مفصل جواب دیا ہے۔ افادۂ عام کی خاطر سوالات و جوابات کو ترجمان میں شائع کیا جا رہا ہے۔

راقم عرصہ کافی عرصہ سے آپ کی مصنفات کا یک جہتی سے مطالعہ کر رہا ہے چند شبہات ایسے واقع ہوئے کہ باوجود کافی حسن ظن کے دل میں بے حد خلجان پیدا کر رہے ہیں۔ عمائدین جماعت سے بالمشافہ کئی مرتبہ گفتگو ہوئی لیکن بجائے ازالہ اضافہ ہوتا رہا۔ انہیں مخلصین کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ براہ راست جناب سے استفادہ کیا جائے لہٰذا جناب کو تکلیف دی جاتی ہے کہ مسائل مندرجہ ذیل کا تشفی بخش جواب تحریر فرما کر مشکور فرمادیں۔ اگر مناسب خیال فرمادیں تو ترجمان میں شائع فرمادیں تاکہ فائدہ عام ہو جائے۔

(۱) تفہیم القرآن جلد ۲ صفحہ ۱۷۴۔ اس مقام پر جان لینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ فتح مکہ کے بعد دور اسلامی کا پہلا حج ۸ھ میں قدیم طریقہ پر ہوا پھر ۹ھ میں دوسرا حج مسلمانوں نے اپنے طریقہ پر کیا مشرکین نے اپنے طریقہ پر اس کے بعد تیسرا حج ۱۰ھ میں خالص اسلامی طریقہ پر ہوا۔ ۸ھ میں کون سے صحابہ حج کو تشریف لے گئے؟ حج کی فرضیت کس سنہ میں ہوئی؟ حج کی فرضیت کے ساتھ احکام نہ تھے؟ حضرت نے عازمین حج کو کوئی ہدایات

نہ دے ؟ سنہ ۹ھ میں صدیقؓ کی زیر قیادت اسلامی طریقہ کو چھوڑ کر اپنے طریقہ پر کیسے حج کی ؟ پھر حضرت نے صحابہ کو غیر اسلامی طریق پر حج کرنے پر کوئی تنبیہ نہ فرمائی ؟ قدیم طریقے میں ننگے طواف ہوتا تھا کیا صحابہ نے بھی ایسا کیا ؟ ہر ایک جزو کا تفصیلی جواب تحریر فرمادیں۔

۲۔ تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ یونس، جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ "حضرت یونسؑ سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں۔ کیا انبیاء معصوم نہیں ہوتے ؟ خصوصاً فریضۂ رسالت میں انبیاء سے کوتاہی کیسے ممکن ہے ؟ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ فریضۂ رسالت کی عدم کوتاہی میں تصریح نہیں؟ اگر نبی سے فریضۂ رسالت میں بھی کوتاہی ممکن ہوسکتی ہے تو پھر دین خداوندی کا کیا رہ جاتا ہے ؟ کیا یہ مضمون موہم ہتکِ انبیاء نہیں ؟

۳۔ ترجمان اکتوبر نومبر ۵۵ء میں جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ احکام منسوخہ پر اب بھی عمل جائز ہے اگر معاشرہ کو انہی ضروریات سے سابقہ ہوجائے۔ اگر احکام شارعؑ نے منسوخ فرمائے ہیں تو پھر ان احکام کو شروع کرنے والا کونسا شارع ہوگا ؟ اگر ہر ذی علم کو اس ترمیم و تنسیخ کا حق دیا جائے جب کہ اعجاب کل ذی رائی برأیہ کا دور دورہ ہے تو کیا یہ تلعّب بالدین نہ ہوگا ؟ آیا احکام منسوخہ میں تعمیم ہے یا تخصیص ؟ محرمات اب پھر حلال ہوسکتے ہیں یا حلال شدہ احکام اب پھر منسوخ ہوسکتے ہیں ؟ مہربانی فرما کر وسعت سے بحث فرمادیں کیونکہ یہ بنیادی امور سے متعلق ہے۔

ترجمان ربیع الاول ۵۷ء "حضرت آدم جس جنت میں تھے وہ زمین پر تھی"
اگر جنت زمین پر تھی تو اھبطوا کیوں فرمایا ؟ اخرجوا زیادہ مناسب نہ تھا ؟ ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین۔ جب پہلے ہی زمین مستقر تھی تو پھر دوبارہ استقرار کیا معنی ؟ نیز جنت کا قرآنی تصور تو یہ ہے عرضها السمٰوات

والارض پھر اس کا تحقق فی الارض کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ اذ یغشی السدرۃ ما یغشی عندھا جنۃ الماوی۔ کیا سدرۃ المنتہیٰ بھی زمین پر تھا؟ بالفرض اگر زمین پر جنت تھی تو اب کہاں ہے؟ کیوں نہ کسی طیارے سے ہم اڑ کر وہاں پہنچ جائیں؟ اگر اڑا دی گئی ہے تو کیوں اور کیا ثبوت؟

۵۔ تفہیمات ج ۲ ص ۴۳ "یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں ہو جانے دیں"۔ کیا انبیاء تمام معاصی سے معصوم نہیں؟ اگر نبی سے نبوت کے ہوتے ہوئے عصمت اٹھ سکتی ہے تو اس کی نبوت و تعلیمات نبوت پر کیسے کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ ہر اہم مقام پر شبہ ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ وہی مقام ہو جہاں نبی سے عصمت اٹھ چکی ہو۔ اس کی کیسے حد بندی ہوگی؟ بالتفصیل بحث فرماویں جزاکم اللہ احسن الجزاء

۶۔ تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۲۱ "پس جو چیز قرآن کی روح سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے رفع جسمانی کی تصریح سے بھی اجتناب کیا جائے اور موت کی تصریح سے بھی"۔ کیا یہ مسئلہ قرآنی لحاظ سے مجمل ہے؟ ما قتلوہ وما صلبوہ میں اگر قتل جسم کی تصریح ہے تو اسی ایک جملہ کے ایک جزو رفعہ میں کونسا اجمال آگیا؟ بصورت دیگر انتشار ضمائر لازم نہ آئے گا جو معیوب ہے؟ یہاں رفع جسم سے کونسا قرینہ مانع ہے جب کہ احادیث رفع جسمانی ہی کی حمایت کر رہی ہیں تو یہاں کیوں رفع جسم مراد نہ ہو؟ پھر اجماع امت بھی اس پر منعقد ہو چکا ہے تو کیا وجہ ہے کہ متفق علیہ مسئلہ کو قرآن کے روح کے لحاظ سے مجمل کہہ کر مشتبہ بنایا جائے؟ پھر الفاظ بھی ایسے مؤکد کہ قرآن کی روح سے زیادہ مطابقت۔

۷۔ تفہیمات حصہ دوم ص ۲۸۹۔ اقامت حدود میں وقت کے حالات اور ملزم کے حالات کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ زمانہ جنگ میں حد موقوف رکھی جاتی ہے۔ قحط کے زمانہ میں

چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جاتے۔ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کو کتاب و سنت کی روشنی میں مدلل بیان فرمادیں۔ حضرت سعد کا واقعہ حدود اللہ کو توڑنے چھوڑنے کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔ انھوں نے کتاب و سنت سے کوئی مستحکم دلیل بیان نہیں کی۔؎ اسی طرح حضرت عمرؓ کا حضرت حاطب کے غلاموں کو چھوڑ دینا اور حاطب سے عوض دلوانا بھی نوعیت جرم کی بدلی ہوئی کیفیت پر دلالت کرتا ہے ورنہ مجرموں کو چھوڑ کر غیر مجرم انسان سے عوض دلوانا کیا معنی۔ یقیناً حضرت عمرؓ کے ذہن میں جرم کی نوعیت کچھ سرقہ کی سی نہ ہوگی بلکہ غصب کی سی ہوگی جس کی عنان ان کے مولیٰ سے لی گئی۔ مہربانی فرما کر اس مسئلہ میں کتاب و سنت کے مستحکم دلائل بیان فرما کر مشکور کریں۔

۸۔ حضرت حوا کی پیدائش کے متعلق تفہیم القرآن ج ۱ ص ۳۱۹ میں جناب نے تصریح کی ہے کہ آدم کی پسلی سے نہیں ہوئی۔ حدیث بخاری خلقت من ضلع آدم کا کیا جواب ہوگا۔

۹۔ تفہیم القرآن جلد اول ص ۸۳۔ کوہ طور کے اٹھائے جانے میں جناب نے محققین مفسرین سے کیوں اختلاف فرمایا ہے؟ اس قول میں کیا قباحت ہے؟ اذ نتقنا الجبل فوقهم کانه ظلة۔ لفظ نتق کس طرف اشارہ کر رہا ہے؟ پھر ظلة کیسے آپ کی تفسیر پر صادق آتا ہے۔ نیز جب کہ تلمود اور بائبل کی روایات بھی اسی قول کی تصدیق کر رہی ہیں۔ اسی طرح لفظ رفعنا اور پھر فوقکم کا صریح مفہوم بھی آپ کی تفسیر کا انکار کر رہا ہے۔ نیز اگر حقیقت رفع مقصود نہ تھی اور صرف تخیل رفع مقصود تھا تو اس کی تصریح سے کونسا امر مانع تھا جب کہ قرآن مجید کی عادۃ مستمرہ ایسی ہے کہ ایسے مقام پر صاف تصریح کر دیتا ہے۔ واقعہ یقللهم فی اعینکم ویقللکم فی اعینهم۔ جب حقیقت قلت و کثرت مقصود نہ تھی، تو واشگاف الفاظ میں بیان فرما دیا۔ اسی طرح

؎ عجیب بات ہے کہ جو لوگ صحابہ پر تنقید کرنے کو ناجائز سمجھتے ہیں وہ خود بے تکلف ان پر تنقید کرتے ہیں۔ کتاب و سنت کی دلیل کے بغیر حدود اللہ کے توڑنے چھوڑنے کا یہ الزام جو حضرت سعد پر لگایا گیا ہے، تنقید کی حد سے گزر کر طعن کی حد تک پہنچ جاتا ہے، مگر علمائے کرام کے لیے سب کچھ جائز ہے۔ (ترجمان)

ویخیل الیه من سحرهم انها تسعیٰ ۔ جب اجماع امت بھی اس پر منعقد ہو چکا ہے تو کیا وجہ ہے ایک متفق علیہ مسئلہ کو مُحمل کہہ کر مشتبہ بنایا جاوے ۔ پھر الفاظ بھی ایسے موکد کہ قرآن کی روح سے زیادہ مطابقت ۔

۱۰ ۔ رسائل و مسائل جلد اول صـ۶۷ـ مہدی پر بحث فرماتے ہوئے جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ جو مسئلہ بھی دین میں ایسی نوعیت رکھتا ہو اس کا ثبوت لازماً قرآن ہی سے ملنا چاہیے مجرد حدیث پر ایسی کسی چیز کی بنا نہیں رکھی جا سکتی جسے مدار کفر و ایمان قرار دیا جائے۔ احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز ثابت ہو سکتی ہے تو گمان صحت نہ علم یقین ۔ یہ قاعدہ کلیہ جو آپ نے تحریر فرمایا ہے کیا اس سے خطرہ میں نہیں پڑ جاتے ؟ کیا تعدد رکعات و سجود و صلوات کی ہیئۃ کذائیہ جو قرآن میں مصرح نہیں ان کے انکار سے کفر لازم نہ آئے گا ؟

۱۱ ۔ آیت رجم کے متعلق جناب نے جو بحث ترجمان میں فرمائی ہے آپ نے اس کے ثبوت میں تامل فرمایا ہے ۔ حالانکہ بخاری شریف نوکرا درسیدہ کے زنا کے معاملہ میں لڑکے کے والد کا حضور کو عرض کرنا انشدک باللہ الا قضیت بیننا بکتاب اللہ اور حضورؐ کا فرمانا والذی نفسی بیدہ لاقضین بینکما بکتاب اللہ ان دونوں قسموں کے بعد کونسا اشتباہ رہ جاتا ہے ؟ کیا حضورؐ کی قسم ہمارے یقین کے لیے ناکافی ہے؟ یا بخاری کی احادیث کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے ؟ پھر فاروق اعظمؓ سے خطبہ نکال مما انزل اللہ آیۃ الرجم فقرءناھا وعقلناھا ووعیناھا سے بھی یہ توقع ہو سکتی ہے کہ یوم الجمعہ مسجد میں فقہاء صحابہ کی موجودگی میں کتاب اللہ و رسول اللہ پر افتراء کر سکتے ہیں ؟ بصورت دیگر نعوذ باللہ جو صحابہ موجود تھے وہ سب حرارت ایمانی سے خالی ہو چکے تھے ۔ ایک نے بھی نہ ٹوکا ۔ جو ایک قمیص کے ٹکڑے پر عمر کو اسی منبر پر ٹوک سکتے ہیں کتاب اللہ پر افتراء میں نہ ٹوک سکے ۔ یا قرآن سے ایک قمیص کا ٹکڑا زیادہ قیمتی تھا؟

آپ کا یہ فرمانا کہ عمرؓ کے اس قول پر اجماع منعقد نہیں ہوا اس لیے کہ سب صحابہ کی موجودگی یقینی نہیں ، کیا صحابہ صلوٰۃ جمعہ سے بھی غیر حاضری کرتے تھے ؟ حضرت عبدالرحمٰن کا فرمانا فانھا دار الھجرۃ والسنۃ فتخلص باھل الفقہ واشراف الناس صاف تصریح نہیں ؟ ان دنوں فقہاء صحابہ مدینہ طیبہ میں موجود تھے ۔ بالفرض اگر تمام موجود نہ تھے کیا موجود حضرات نے غیر موجود حضرات سے اس مسئلہ کی تصدیق ، یا تکذیب کسی نے نہ کرائی ؟ اگر واقعی صحابہ کا کتاب اللہ کے ساتھ یہی تساہل و تغافل رہا ہے اور کتاب اللہ میں کمی بیشی ہوتی رہی تو روافض بالکل حق بجانب ہیں ۔ مہربانی فرماکر اس مسئلہ کو کتاب وسنت سے مدلل بیان فرما دیں ۔ حضور کی قسم اور عمرؓ کا تشدیدی خطبہ ، حدیث بخاری کے مقابل کوئی قوی دلیل چاہیے کسی مفسر و مجتہد کا قول مشکل سے مقابل ہو سکے گا ۔

۱۲- ترجمان القرآن ربیع الثانی ۷۵ھ میں جناب نے حضرت صدیق کی بندش کفالت مسطحؓ کو غیر اسلامی حمیت سے تعبیر فرمایا ہے ۔ کیا صدیقؓ کا نبوت سے صرف بیٹی ہی کا تعلق تھا ؟ بالفرض اگر حضرت کے کسی دوسرے حرم پر یہ بہتان ہوتا تو کیا حضرت صدیق کو غیرت نہ آتی ؟ کیا وہاں الحب للہ والبغض فی اللہ کا جذبہ کارفرمانہ تھا ؟ لا یاتل اولوالفضل سے استدلال صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہاں صرف کفالت کا کھونا نہایت نرم لہجہ میں مقصود تھا ، چنانچہ لفظ اولوالفضل والسعۃ کا اور پھر الا تحبون ان یغفر اللہ لکم سے ان کے پاکیزہ جذبات سے معافی کی اپیل ہے ، اس میں عتاب کی بو بھی نہیں اس کو وعید تصور کرنا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے ۔ علاوہ ازیں یہاں کفالت کی طرف تعرض کیا گیا ہے بندش کفالت کے اصل محرکات کو نہیں چھیڑا گیا ، جس کو آپ نے غیر اسلامی حمیت سے تعبیر فرمایا ہے ۔ اگر یہ محرکات غیر اسلامی ہوتے تو ان یؤتوا اولی القربیٰ کے بجائے انہی محرکات کا اپریشن ہوتا ۔ واللہ لا یستحیی من الحق ۔ منبع فساد کو چھوڑ کر شاخوں کا انسداد قرآن کی

حکیمانہ شان سے بعید ہے۔ کفالت تو ان الفاظ سے کھل گئی، لیکن یہ منبع فساد غیر اسلامی حمیت تو ان کے دل میں ویسے ہی مستحکم رہی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کے متعلق اسی ترجمان ربیع الاول ۷۵ھ میں جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ غالباً یہی شخصی عظمت کا تخیل تھا جس نے اضطراری طور پر حضرت عمرؓ کو تھوڑی دیر کے لیے مغلوب کر دیا۔ کیا نبی کی شخصیت اور اس کی عظمت کا تخیل اسلام میں ممنوع ہے؟ واللہ لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ الحدیث کا کیا معنی۔ باقی رہا قانون ربانی کے مقابلہ میں نبوت پرستی یا شخصیت پرستی تو محبوب رب عالم کی زندگی میں تو عمرؓ شخصیت پرست نہ تھے، بعد از انتقال یہ شخصیت پرستی کہاں سے ان کے دل میں گھس گئی؟ اساری بدر۔ صلح حدیبیہ۔ مسئلہ حجاب۔ رئیس المنافقین کا جنازہ وغیرہ بے تعداد واقعات موجود ہیں۔ صحابہ کرام اور خلفاء راشدین مہدیین کے متعلق بھی کس حد تک سوء ظن جائز ہے[1]؟ کیا ان حضرات کے افعال کی ان توجیہات کے علاوہ اور توجیہ ناممکن تھی؟ اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم غرضا بعدی فمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم اور اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم کا کیا مقصد ہوگا؟

۱۳۔ کیا آپ معصوم عن الخطا ہیں؟ اگر نہیں تو کیا آپ کے اجتہادات پر تنقید جائز ہے؟ اگر آپ تنقید سے بالاتر نہیں تو تنقید کرنے والے علماء پر کیوں طعن کیا جاتا ہے؟ اگر اسلام کی تعلیمات کی تعبیر کا حق صرف جماعت کے علماء کے لیے مخصوص کر دیا جائے تو اسلامی علوم کو ترقی کے بجائے رکاوٹ نہ ہوگی؟ آمرانہ رجحانات ترقی پذیر نہ ہوں گے؟ کیا موجودہ اختلاف جب کہ دیانتداری پر مبنی ہو اختلاف امتی رحمۃ نہ ہوگا؟ انہی اختلافات میں مختلف ذہنی صلاحیتوں کے جواہر منظر عام پر نہ آجائیں گے جن سے امت کو فائدہ پہنچتا رہا ہے اور رہے گا؟

۱۴۔ کیا صحابہ کرام پر تنقید جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو حدیث اللہ اللہ فی اصحابی اور

[1] صرف اس حد تک کہ "وہ کتاب و سنت کی دلیل کے بغیر حدود اللہ کو توڑنے چھوڑتے تھے"۔ ترجمان

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم کا کیا جواب ہوگا؟

جواب: آپ کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے یہ بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کہ میری تحریروں کے متعلق جو شکوک اور شبہات بعض لوگ جان بوجھ کر دلوں میں ڈال رہے ہیں ان کو صاف کرنے کے لیے میری طرف رجوع کرنا تو بلاشبہ ایک درست طریقہ ہے، مگر تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے مناسب یہ ہے کہ پہلے خود بھی تحقیق کی کوشش کر لیا کریں تاکہ جس الجھن کو وہ تھوڑا سا وقت صرف کر کے خود رفع کر سکتے ہوں اس کے لیے خواہ مخواہ خط و کتابت کی زحمت میں نہ پڑیں۔ اصحاب فتنہ کے لیے تو اب کوئی کرنے کا کام اس کے سوا باقی نہیں رہا ہے کہ وہ میری تحریروں میں کیڑے چنتے پھریں اور جگہ جگہ انہیں پھیلا کر لوگوں کے دماغوں میں الجھنیں پیدا کیا کریں۔ مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر بس ان الجھنوں ہی کو صاف کرنے میں لگا رہوں جو ان حضرات نے پیدا کی ہیں۔ آپ براہ کرم خود غور کریں کہ ان حضرات کی انگیخت سے ۱۴ سوالات تو تنہا آپ نے فرمائے ہیں، اور ایسے سوالات کرنے والے اکیلے آپ نہیں ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے ہر گوشے سے اس طرح کے سوالات آئے دن میرے پاس آتے رہتے ہیں، کیونکہ سارے برعظیم میں فتنہ پردازوں کا ایک پورا طائفہ ان سوالات کی فصل بونے میں لگا ہوا ہے۔ اب کیا آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح یہ حضرات اپنی عمر عزیز اس فضول کام میں ضائع کر رہے ہیں، اسی طرح میں بھی ان کے پیدا کردہ سوالات کی جواب دہی میں اپنی عمر عزیز ضائع کر دوں؟

اب آپ کے سوالات کا جواب سلسلہ وار حاضر ہے:

(۱) اس عبارت کا منشا سمجھنے میں آپ کو کسی قسم کی دقت نہ پیش آتی اگر معترضین نے آپ کے دل کو شک و شبہ کی بیماری نہ لگا دی ہوتی، اور آپ خود بھی کچھ عقل سے کام لیتے۔ عبارت یہ ہے کہ "فتح مکہ کے بعد پہلا حج ۸ھ میں قدیم طریقے پر ہوا"۔ اس میں یہ کہاں لکھا ہے کہ صحابہ کرام نے یہ حج قدیم طریقے پر کیا؟ پھر وہ سوالات جو اس عبارت پر آپ نے کیے ہیں آخر کہاں سے پیدا ہو گئے؟ آپ سیرت پاک کے موضوع پر کوئی کتاب بھی اٹھا کر دیکھتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ مکہ معظمہ رمضان ۸ھ میں اپنی

فتح ہوا۔ دوسرے ہی مہینے حُنین اور طائف کے معرکے پیش آئے جن سے ذی القعدہ ۸ھ کے وسط میں حضور فارغ ہوئے اور عُمرہ کر کے حج کیے بغیر اپنے اصحاب کے ساتھ مدینے واپس تشریف لے گئے۔ اُس وقت یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حج کے قدیم طریقے کو، جو صدیوں سے زمانۂ جاہلیت میں رواج پا چکا تھا، اور جس کے مطابق حج کرنے کے لیے ہزاروں لاکھوں مشرکین مکّہ میں جمع ہو چکے تھے یا عنقریب جمع ہونے والے تھے، یک لخت بدل ڈالا جاتا۔ اگر اُس وقت ایسا کیا جاتا تو حُنین کے معرکہ سے کئی گنا زیادہ شدید معرکہ مسجد الحرام کے حدود میں پیش آجاتا۔ اس لیے اُس سال جاہلیت کے طریقوں سے کوئی تعرض نہ کیا گیا اور حج جس طرح پہلے ہوتا تھا اُسی طرح ہونے دیا گیا۔ؒ

دوسرے سال ۹ھ میں آپ نے حضرت ابوبکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو حج کے موقع پر بھیجا اور اعلان کرا دیا کہ لا یحجن بعد عامنا ھٰذا مشرک ولا یطوفن بالبیت عریان "اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرنے پائے اور نہ کوئی شخص برہنہ طواف کرے"۔ یہ اعلان قرآن مجید کے اس حکم کی بنیاد پر تھا کہ اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِھِمْ ھٰذَا (التوبہ رکوع ۴) "مشرکین تو نجس ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آنے پائیں"۔ تیسرے سال ۱۰ھ میں اس حکم کی تعمیل کی گئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تشریف لے جا کر حج کے خالص اسلامی طریقے کو ہمیشہ کے لیے قائم فرما دیا۔

آپ کا یہ سوال کہ حج کس سال فرض ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ محققین کے نزدیک وہ ۹ھ کے آخر، یا ۱۰ھ کے آغاز میں فرض ہوا ہے، اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ صحیحین میں بنی عبد القیس کے وفد کی حاضری کا جو قصہ آیا ہے اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارکان اسلام بیان کرتے ہوئے صرف چار ارکان کا ذکر فرمایا ہے، حج کا ذکر نہیں فرمایا۔ یہ وفد بالاتفاق ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے بعد حاضر ہوا تھا (زاد المعاد۔ جلد اول صفحہ ۲۶۶۔ جلد دوم صفحہ ۳۴ - ۳۹)۔ لیکن چونکہ اس سال

ھ یہ صرف تاریخی واقعات سے میرا استنباط ہی نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم ترین سیرت نگار ابن ہشام نے اس کی تصریح بھی کی ہے۔ وہ ۸ھ کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے "وحج الناس تلک السنۃ علی ما کانت العرب تحج علیہ"۔ اس سال لوگوں نے اسی طریقے پر حج کیا جس پر اہل عرب کیا کرتے تھے" (جلد ۴ صفحہ ۱۴۴)

جاہلیت کے رواجِ نسی کی وجہ سے حج ذی القعدہ میں پڑتا تھا، اور مشرکین کے ساتھ حج کرنا بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان نہ تھا، اس لیے آپ خود حج کے لیے تشریف نہ لے گئے اور حضرت ابوبکرؓ و علیؓ کو بھیجا تاکہ جاہلیت کے طریقوں کی تنسیخ کا اعلان فرما دیں۔ حج کے اسلامی احکام کی تشریح و توضیح اور عملی تعلیم ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر ہی ہوئی ہے۔

(۲) اس اعتراض کا جواب خود دینے کے بجائے میں قرآن ہی سے دلوانا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ قرآن مجید میں چار مقامات پر حضرت یونسؑ کا قصہ آیا ہے۔ براہِ کرم ان سب کو پڑھ لیجیے۔

سورۂ یونس میں ہے:

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ (آیت ۹۸)

پس کیوں نہ ہوئی کوئی ایسی بستی جو (عذاب دیکھ کر) ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لیے نافع ہوا ہو؟ سوائے یونس کی قوم کے کہ جب وہ لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ان سے رسوائی کا عذاب ہٹا دیا اور ان کو ایک وقتِ خاص تک سامانِ زندگانی دیا۔

سورۂ انبیاء میں ہے:

وَذَا النُّونِ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (آیت ۸۷)

اور یاد کرو مچھلی والے (یونسؑ) کو جب کہ وہ خفا ہو کر چل دیا اور سمجھا کہ (اس چلے جانے پر) ہم گرفت نہ کریں گے[1]۔ پس وہ پکار اٹھا تاریکیوں میں کہ تیرے سوا کوئی خدا نہیں، تو بے عیب ہے، بے شک میں قصوروار ہوں۔

سورۂ صافات میں ہے:

وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَهُوَ مُلِيمٌ

اور بے شک یونس رسولوں میں سے تھا جس وقت بھاگ گیا وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف تو قرعہ ڈالنے میں (اہلِ کشتی کے ساتھ) شریک ہوا اور وہی ملزم ٹھیرا۔ پھر نگل لیا اس کو مچھلی نے اور وہ

[1] شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ ہے "پھر سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے"۔ مولانا اشرف علی صاحب کا ترجمہ ہے "اور انھوں نے یہ سمجھا کہ ہم ان پر (اس چلے جانے میں) کوئی داروگیر نہ کریں گے۔"

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (آیت ۱۳۹ - ۱۴۴)

ملامت میں پڑا ہوا تھا۔ اگر نہ ہوتا وہ تسبیح کرنے والوں میں سے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ ہی میں رہ جاتا۔

سورۂ قلم میں ہے:

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ (آیت ۴۸ - ۴۹)

پس اے محمدؐ صبر کے ساتھ اپنے رب کے حکم کا انتظار کرو اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ جب کہ اس نے پکارا اور وہ غم سے گھٹ رہا تھا۔ اگر اس کے رب کے احسان نے اس کی دستگیری نہ کی ہوتی تو پھینک دیا جاتا چٹیل میدان میں اور وہ رہتا ملامت زدہ۔[۲]

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ حضرت یونسؑ سے کوئی نہ کوئی قصور ضرور سرزد ہوا تھا جس پر انہیں مچھلی کے پیٹ میں پہنچایا گیا، اور وہ قصور بے صبری کی نوعیت کا تھا، اور لامحالہ وہ فریضۂ رسالت کی ادائیگی ہی کے سلسلے میں ہوا تھا۔ نیز ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونسؑ اپنی قوم سے ناراض ہو کر اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اپنا مستقرِ رسالت چھوڑ گئے تھے، اسی وجہ سے اُن کی قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے وہ خاص رعایت فرمائی جو کبھی کسی قوم کے ساتھ نہ فرمائی گئی تھی، یعنی یہ کہ عذاب دیکھ لینے کے بعد جب وہ ایمان لے آئی تو اسے معاف کر دیا گیا؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی یہ مستقل سنت ہے کہ عذاب آتے دیکھ کر ایمان لانا کسی کے لیے نافع نہیں ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ہی بیان ہے، اس میں کسی قسم کی کمی و بیشی میں نے اپنی طرف سے نہیں کی ہے۔ اب اس پر آپ کو یا کسی اور کو اعتراض ہو تو یہ اعتراض مجھ پر نہیں، قرآن اور اس کے بھیجنے والے خدا پر ہے اور اس کا جواب اُسی کے ذمہ ہے۔ آپ کا یہ ارشاد کہ "کیا یہ مضمون موہم ہتک انبیاء نہیں ہے" اس مفروضہ پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کی عزت کا خیال آپ کو ان کے بھیجنے والے خدا سے بھی بڑھ کر ہے۔ اگر یہ بات

---

[۱] مولانا اشرف علی صاحب کا ترجمہ ہے "اور (تنگدلی میں) مچھلی (کے پیٹ میں جانے) والے (پیغمبر یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جیے۔"

[۲] شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ ہے "اور وہ ہوتا ملامت کیا گیا۔"

نہیں ہے تو جو مضمون اللہ نے خود اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے اس کو موجبِ ہتک یا موہمِ ہتک قرار دینے کی اور کیا توجیہ آپ کر سکتے ہیں ؟

(۳) اس مضمون کا حوالہ آپ نے غلط دیا ہے۔ اوّل تو اکتوبر نومبر ۵۵ء کا کوئی یکجائی نمبر شائع ہی نہیں ہوا تھا۔ دوسرے یہ مضمون نہ اکتوبر کے پرچے میں ہے نہ نومبر کے پرچے میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص سے آپ نے یہ اعتراض سن کر اپنی فہرست میں درج فرما لیا ہے اسے خود صحیح حوالہ معلوم نہ ہوگا۔ دراصل یہ مضمون رسائل و مسائل حصہ دوم میں صفحہ ۱۱۵ پر درج ہے۔ وہاں اُس شبہ کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو نسخ کا مسئلہ سن کر ایک عام آدمی کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ جن آیات کا حکم منسوخ ہو چکا ہے ان کی قرآن میں اب کیا ضرورت ہے، کیوں نہ ان کی تلاوت بھی منسوخ ہو گئی۔ اس کو رفع کرنے کے لیے میں نے قرآن میں ان احکام کے باقی رہنے کی حکمت یہ بتائی ہے کہ اگر معاشرے میں کبھی ہم کو پھر اُن حالات سے سابقہ پیش آ جائے جن میں وہ احکام دیئے گئے تھے تو ہم ان پر عمل کر سکتے ہیں۔ مثلاً کسی ملک میں مسلمان اُس طرح کے حالات سے دوچار ہوں جو مکی زندگی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو پیش آئے تھے تو مکی دور کی تعلیم صبر و تحمل پر عمل کیا جائے گا نہ کہ مدنی دور کی تعلیم جہاد و قتال پر، حالانکہ بیشتر مفسرین نے احکامِ قتال سے مکی دور کی اُن آیات کو منسوخ قرار دیا ہے۔ اسی طرح اس حالت میں مسلمان اُن بہت سے احکام و قوانین کی پابندی سے معاف رکھے جائیں گے جو مدنی دور میں نازل ہوئے اور جن پر عمل درآمد اسلامی حکومت کی موجودگی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ آپ کا یہ سوال کہ منسوخ شدہ احکام کو پھر سے مشروع کونسا شارع کرے گا، تنہا میری طرف راجع نہیں ہوتا بلکہ اُن تمام علماء کی طرف راجع ہوتا ہے جو ابھی چند سال پہلے تک انگریزی دور میں مکی آیات سے قومی طرزِ عمل کے لیے رہنمائی حاصل کرتے تھے اور مدنی دور کے احکامِ جنگ اور حدود اللہ کے اجراء کو ملتوی قرار دیتے تھے۔

(۴) آپ کے اس اعتراض کا جواب ترجمان القرآن کے اسی پرچے میں موجود ہے جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔ اگر آپ نے ربیع الاول ۷۰ھ کا ترجمان ملاحظہ فرمایا تھا جیسا کہ آپ کے سوال سے

معلوم ہوتا ہے، تو ضرور وہ جواب آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ اس کے بعد یہ اعتراض دوبارہ کرنے کی کیا ضرورت باقی رہ گئی؟

اس سلسلہ میں جو سوالات آپ نے کیے ہیں، اگرچہ ان سب کے جوابات ممکن ہیں، لیکن میں اس بحث کو غیر ضروری سمجھتا ہوں اس لیے قصداً انہیں نظر انداز کرتا ہوں[1]۔ آدم علیہ السلام جس جنت میں رکھے گئے تھے، اس کی جائے وقوع کا مسئلہ اسلام میں کوئی بنیادی تو درکنار فروعی مسئلہ بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص محض قرآن کو سمجھنے کی کوشش میں اس کے متعلق کسی خیال کا اظہار کرے تو زیادہ سے زیادہ اس سے اتنا ہی تعرض کیا جا سکتا ہے کہ اس کی رائے کو آپ پسند کریں تو قبول کر لیں، نہ پسند کریں تو رد کر دیں۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں ہر مسئلہ پہلے ردوکد اور بحث و مناظرہ کا موضوع بنتا ہے اور پھر یہی ردوکد اس کو ایک اعتقادی مسئلہ بنا کر رکھ دیتی ہے جس پر دو فریق ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہو جاتے ہیں اور جب تک فریقین کے نکاح نہ ٹوٹ جائیں معاملہ ختم نہیں ہوتا۔ اس مصیبت سے نجات پانے کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ پہلے ہی مرحلہ پر سوال و جواب کا سلسلہ توڑ دیا جائے۔ آپ کا اطمینان جس بات پر نہیں ہوتا اسے آپ قطعاً نہ مانیے مگر بے فائدہ بحث کی آخر کیا ضرورت ہے۔

(۵) انبیاء علیہم السلام کی عصمت بلاشبہ ایک بنیادی چیز ہے اور ہم، آپ، سب سے بڑھ کر ان کے بھیجنے والے خدا نے اس امر کا اہتمام فرمایا ہے کہ ان کا اعتماد قائم ہو۔ لیکن اسی خدا نے اپنی کتاب پاک میں متعدد انبیاء کی ایسی لغزشوں کا بھی ذکر کیا ہے جن پر گرفت یا تنبیہ کی گئی اور اس کے ساتھ وہی خدا اپنی کتاب میں ہم کو یہ اطمینان بھی دلاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو کبھی کسی چھوٹی سے چھوٹی لغزش پر بھی قائم نہیں رہنے دیا گیا، بلکہ بروقت اس کی اصلاح کر دی گئی[2]۔ یہ حقیقت اگر آپ کے پیش نظر ہو

---

[1] جن حضرات کو اس بحث کی تفصیل سے دلچسپی ہو وہ براہ کرم خود ہی تفسیر روح المعانی (ج ۱۔ ص ۲۱۴) اور تفسیر المنار (ج ۱۔ ص ۲۷۷) میں اس کو نکال کر دیکھ لیں۔ وہاں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس مسئلے میں مفسرین کے کتنے اقوال ہیں، اور یہ بھی کہ ہر قول کی دلیل کیا ہے۔

[2] یہی بات علمائے اصول نے بھی اپنی کتابوں میں بیان کی ہے کہ نبی سے لغزش اور رائے کی غلطی (باقی اگلے صفحہ پر)

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان لغزشوں کے ذکر سے حضراتِ انبیاء کے اعتقاد میں ذرہ برابر بھی خلل واقع نہیں ہوتا، البتہ اس سے خدا اور بندے کا فرق اچھی طرح کھل جاتا ہے اور اس خطرے کا امکان باقی نہیں رہتا کہ ان برگزیدہ شخصیتوں کی طرف کوئی شخص الوہیت کی صفات منسوب کرنے لگے۔

(۶) اس اعتراض کا جواب دسمبر ۵۵ء کے ترجمان القرآن میں صفحہ ۲۸۰ پر دیا جا چکا ہے۔

(۷) اس بحث کو اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں تو علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ کی کتاب اعلام الموقعین میں فصل فی تغیر الفتوی واختلافہا بحسب تغیر الازمنۃ والامکنۃ والاحوال والنیات والعوائد کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں انہوں نے احادیث و آثار سے بکثرت مثالیں اس امر کے ثبوت میں جمع کی ہیں کہ واقعات و حوادث پر اسلامی احکام کو آنکھیں بند کر کے چسپاں نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے لیے زمانے اور مقام اور اشخاص متعلقہ کے انفرادی حالات اور دوسری بہت سی چیزوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ آپ نے میری پیش کردہ جن مثالوں پر گرفت فرمائی ہے ان سب پر، اور ان کے علاوہ متعدد دوسری مثالوں پر بھی علامہ موصوف نے مفصل بحث کی ہے۔

(۸) قرآن مجید میں کسی جگہ بھی یہ تصریح نہیں ہے کہ حضرت حوا کو آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس خیال کی تائید میں جو چیز پیش کی جا سکتی ہے وہ قرآن کا یہ ارشاد ہے کہ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (النساء - ۱) اور جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (الاعراف ۲۴)۔ لیکن ان دونوں آیتوں میں منہا کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اسی نفس سے اس کا جوڑا بنا لیا، اور یہ بھی کہ اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا۔ ان دونوں میں سے کسی معنی کو بھی ترجیح دینے کے لیے کوئی دلیل قرآن کی ان آیتوں میں نہیں ہے۔ بلکہ قرآن کی بعض دوسری آیتیں تو دوسرے معنی کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً سورہ روم میں فرمایا وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا (رکوع ۳) اور سورہ شوریٰ میں فرمایا وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا (رکوع ۲) یہی مضمون

صادر ہو سکتی ہے، البتہ اس کا لغزش اور غلطی پر قائم رہ جانا ممکن نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح کا ذمہ لیا ہے۔ ملاحظہ ہو اصول السرخسی جلد اول صفحہ ۳۱۸ ۔۔۔ دوم صفحہ ۵ - ۸۶ - ۹۱

سورۂ نحل رکوع ۱۰ میں بھی آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں آیتوں میں من انفسکم کے معنی من جنسکم ہی لیے جائیں گے، نہ یہ کہ تمام انسانوں کی بیویاں ان کی پسلیوں سے پیدا ہوئی ہیں۔ اب اگر پہلے معنی کو ترجیح دینے کے لیے کوئی بنیاد مل سکتی ہے تو وہ حضرت ابوہریرہؓ کی وہ روایات ہیں جو بخاری و مسلم نے نقل کی ہیں۔ مگر ان کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ ایک روایت میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان الفاظ میں نقل فرماتے ہیں کہ:

المرأة کالضلع ان اقمتھا کسرتھا	عورت پسلی کے مانند ہے، اگر تو اسے سیدھا کرے گا تو
وان استمتعت بھا استمتعت بھا و	توڑ دے گا اور اگر اس سے فائدہ اٹھائے گا تو اس کے اندر
فیھا عوج	کجی باقی رہتے ہوئے ہی فائدہ اٹھا سکے گا۔

اور دوسری روایت میں انھوں نے حضور کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

استوصوا بالنساء خیراً فانھن خلقن	عورتوں کے معاملے میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو کیونکہ
من ضلع وان اعوج شیٔ فی الضلع اعلاہ	وہ پسلی سے پیدا ہوئی ہیں، اور پسلی کا سب سے ٹیڑھا حصہ
فان ذھبت تقیمہ کسرتہ وان ترکتہ	اس کا بالائی حصہ ہوتا ہے۔ اگر تو اسے سیدھا کرنے کی کوشش
لم یزل اعوج فاستوصوا بالنساء خیراً	کرے تو اس کو توڑ دے گا اور اگر چھوڑ دے تو وہ ٹیڑھی ہی
	رہے گی، لہٰذا عورتوں کے معاملہ میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو

ان دونوں حدیثوں میں سے پہلی حدیث تو عورت کو پسلی سے محض تشبیہ دے رہی ہے، اس میں سرے سے یہ ذکر ہی نہیں ہے کہ وہ پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ البتہ دوسری حدیث میں پسلی سے پیدائش کی تصریح ہے، لیکن یہ امر لائقِ غور ہے کہ اس میں حضرت حوا، یا پہلی عورت، یا ایک عورت کی نہیں بلکہ تمام عورتوں کی پیدائش پسلی ہی سے بیان کی گئی ہے[1]۔ کیا فی الواقع دنیا کی تمام عورتیں پسلیوں

---

[1] یہ الفاظ بخاری، کتاب النکاح والی روایت کے ہیں۔ دوسری روایت جو امام بخاری نے کتاب احادیث الانبیاء میں نقل کی ہے اس کے الفاظ ہیں فان المرأۃ خلقت من ضلع، کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ اس صورت میں المرأۃ سے مراد ہر عورت، اور عورتوں کی پوری صنف ہوگی نہ کہ وہ ایک خاص عورت جو دنیا میں سب سے پہلے پیدا کی گئی

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہی سے پیدا ہوا کرتی ہیں ؟ اگر یہ بات نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے ، تو ماننا پڑے گا کہ یہاں خُلِقَتۡ مِنۡ ضِلَعٍ کے الفاظ اس معنی میں نہیں ہیں کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی یا بنائی گئی ہیں ، بلکہ اس معنی میں ہیں کہ ان کی ساخت میں پسلی کی سی کجی ہے ۔ اس کی مثال قرآن مجید کی یہ آیت ہے کہ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ۔ اس کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ انسان جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے ، بلکہ یہ ہیں کہ انسان کی سرشت میں جلد بازی ہے ۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پسلی سے حضرت حوا کی پیدائش کا خیال قرآن ہی میں نہیں حدیث میں بھی کسی مضبوط دلیل پر مبنی نہیں ہے ۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ بنی اسرائیل سے یہ روایت نقل ہو کر مسلمانوں میں شائع ہوئی اور بڑے بڑے لوگوں نے اسے نہ صرف قبول کیا بلکہ اپنی کتابوں میں بھی ثبت کر دیا ۔ مگر کیا یہ صحیح ہے کہ اللہ اور رسول کی سند کے بغیر محض بڑے لوگوں کے اقوال کی بنا پر اسے ایک اسلامی عقیدہ بنا دیا جائے اور جو کوئی اس پر ایمان نہ لائے اسے گمراہ قرار دیا جائے ؟

(۹) رفع طور کے بارے میں جو کچھ میں نے تفہیم القرآن جلد اوّل میں صفحہ ۸۴ پر اور جلد دوم میں صفحہ ۹۵ پر ترجمہ و تشریح میں لکھا ہے اس کو پھر غور سے پڑھیے ۔ اس میں کہیں بھی پہاڑ کے اٹھائے جانے سے انکار نہیں ہے ۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ اس اُٹھائے جانے کی تفصیلی کیفیت متعین کرنا مشکل ہے ۔ پہاڑ کے اُٹھائے جانے کی ایک صورت یہ ہے کہ پورا پہاڑ زمین سے نکال کر اوپر اٹھا لیا جائے ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پہاڑ کی جڑ اکھاڑ کر اسے ایک جانب اس طرح جھکا دیا جائے کہ وہ اپنے دامن میں کھڑے ہوئے لوگوں پر چھا جائے اور انہیں یوں محسوس ہو کہ گویا اب وہ ان پر اوندھا جائے گا ۔ سورۂ بقرہ کے الفاظ رَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ سے پہلا مفہوم ذہن میں متبادر ہوتا ہے ۔ اور سورۂ اعراف کے الفاظ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوۡۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمۡ دوسرے مفہوم کی طرف ذہن کو لے جاتے ہیں ۔ نتق کے معنی کسی چیز کو اکھاڑنے اور جھنجھوڑنے کے ہیں ۔ قاموس میں ہے نَتَقَهٗ ، زعزعہ و نفضہ ۔

(بقیہ حاشیہ) اس سلسلے میں یہ بات حیرت انگیز ہے کہ سائل نے بخاری کے حوالہ سے خلقت من ضلع آدم کے الفاظ نقل کیے ہیں ، حالانکہ بخاری میں کسی جگہ بھی یہ الفاظ نہیں آئے ہیں ۔

مفردات امام راغب میں ہے نتق الشئ جذبه ونزعه حتیٰ یسترخی۔ اساس البلاغہ میں ہے نتق البعیر الرحل، زعزعه ونتق الله الجبل رفعه مزعزعاً فوقهم۔ اسی بنا پر میرا خیال یہ ہے کہ واقعہ کی ان دونوں ممکن صورتوں میں سے کسی ایک کی تعیین جزم کے ساتھ نہیں کی جا سکتی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان دونوں صورتوں کو یکساں ممکن تسلیم کرتا ہو اور کسی ایک کی تعیین میں توقف کرے تو وہ آخر کس جرم کا مرتکب ہے جس پر اتنی لے دے کی جائے؟ اس پر مزید قابل افسوس بات یہ ہے کہ لوگ جس چیز پر لے دے کرتے ہیں اس کو میری اصل کتاب میں نکال کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں اٹھاتے اور محض سنی سنائی روایات پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کا یہ فقرہ کہ "کیا وجہ ہے ایک متفق علیہ مسئلہ کو مجمل کہہ کر مشتبہ بنایا جاوے پھر الفاظ بھی ایسے مؤکد کہ قرآن کی روح سے زیادہ مطابقت"، صاف غمازی کر رہا ہے کہ آپ نے تفہیم القرآن کی وہ عبارت خود نکال کر نہیں پڑھی جس پر آپ نے اس قدر شدت کے ساتھ گرفت فرمائی ہے، کیونکہ اس میں کہیں یہ نہیں لکھا گیا ہے کہ یہ مجمل مفہوم جو میں بیان کر رہا ہوں یہ قرآن کی روح سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ اس غیر محتاط طریق گرفت کا مزید ثبوت یہ ہے کہ آپ اپنی تفسیر رفع کے حق میں بے تکلف بائیبل کا حوالہ دے رہے ہیں، حالانکہ اس واقعہ کے متعلق بائیبل کی عبارت میں نے تفہیم القرآن جلد دوم میں صفحہ ۹۵ پر لفظ بلفظ نقل کر دی ہے اور وہ آپ کے بیان کے بالکل خلاف ہے۔ رہی تلمود، تو اگر وہ آپ کی نظر سے گزری ہو تو براہ کرم اس کی عبارت کا حوالہ مجھے ضرور بھیج دیں۔

(۱۰) آپ نے اس سوال میں بھی میری پوری بات نقل نہیں کی ہے بلکہ اس میں سے صرف ایک ٹکڑا نکال لیا ہے۔ براہ کرم میری پوری عبارت جو رسائل و مسائل جلد اوّل میں صفحہ ۶۶ سے ۶۸ تک ہے بغور پڑھیے، اور اس کے بعد فقہ حنفی کے نامور امام شمس الائمہ سرخسی کی حسب ذیل عبارات ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے اصول السرخسی میں اسی موضوع کے متعلق لکھی ہیں۔ شاید کہ اس کے بعد آپ کو اطمینان ہو جائے کہ جو اصولی بات میں نے لکھی ہے وہ میری اپنی گھڑی ہوئی نہیں ہے بلکہ سلف سے مسلّم چلی آرہی ہے۔ امام موصوف خبر واحد کے متعلق لکھتے ہیں:

"خبرِ واحد علمِ یقین کی موجب نہیں ہوتی، کیونکہ اس میں راوی کی غلطی کا احتمال ہوتا ہے البتہ وہ راوی کے ساتھ حسنِ ظن کی بنا پر اور اس بنا پر کہ اُس کی عدالت کا حال معلوم ہونے کی وجہ سے اس کے صدق کا پہلو راجح ہوجاتا ہے، ایک ایسی دلیل ضرور قرار پاتی ہے جس کے مطابق عمل کرنا واجب ہوتا ہے۔ پس اس قسم کی خبر کا حکم اس کی دلیل کی طاقت کے لحاظ سے ثابت ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے انکار کرنے والے کی تکفیر نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس کی دلیل موجبِ علم یقین نہیں ہے، اور اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہوتا ہے کیونکہ اس کی دلیل موجب عمل ہے، اور اس کا منکر اگر تاویل کی بنا پر انکار نہیں کرتا بلکہ بجائے خود خبرِ واحد ہی کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو اسے گمراہ قرار دیا جائے گا، لیکن اگر وہ خبرِ واحد کے مطابق عمل کرنے کو واجب مانتے ہوئے تاویل کی بنا پر کسی خبر کو رد کرے تو اسے گمراہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ (جلد اول صفحہ ۱۱۲)

پھر وہ خبرِ متواتر کے متعلق فرماتے ہیں:

"اس کی تعریف یہ ہے کہ اسے اتنے کثیر التعداد لوگوں نے نقل کیا ہو کہ اتنے بہت سے آدمیوں اور مختلف علاقوں کے رہنے والے آدمیوں کے کسی جھوٹی بات پر متفق ہوجانے کا تصور نہ کیا جاسکتا ہو، اور ان کی یہ کثرت ہمارے زمانے سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصلاً ہر دور میں پائی جاتی ہو۔ نمازوں کی تعداد، اور نماز کی رکعات کی تعداد، اور زکوٰۃ اور خونبہا کی مقداریں، اور ایسی دوسری خبریں اس کی مثال ہیں۔۔۔ پس جب مختلف علاقوں کے رہنے والے راویوں کی کثرتِ تعداد کو دیکھتے ہوئے تہمتِ اختراع کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی ہو تو اس طرح کی خبر گویا ایسی ہے جیسے ہم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سن رہے ہیں، اور یہ چیز جمہور فقہاء کے نزدیک موجبِ علمِ یقین ہے۔"

(جلد اول صفحہ ۲۸۲-۲۸۳)

اس کے بعد وہ اُس خبر کو لیتے ہیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے تو اخبار آحاد کی قسم میں داخل تھی لیکن بہت سی روایتوں میں ایک مشترک معنی پائے جانے کی وجہ سے وہ مشترک معنی تواتر کے درجے میں آگیا ہو۔ اصطلاح میں ایسی خبر کو خبرِ مشہور کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں علماء کے اختلافات کا ذکر

کرنے کے بعد امام سرخسی جس قول کو ترجیح دیتے ہیں وہ یہ ہے :

عیسیٰ بن اَبان رحمۃ اللہ نے بیان کیا ہے کہ اس قسم کی خبریں تین اقسام پر منقسم ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کا انکار کرنے والے کو گمراہ کہا جا سکتا ہے مگر کافر نہیں کہا جا سکتا، مثلاً وہ خبر جس کی رو سے زانی محصن کی سزا رجم ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کے منکر کو گمراہ نہیں کہا جا سکتا البتہ خطا کار کہا جا سکتا ہے اور یہ اندیشہ ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ وہ گناہ گار ہو، مثلاً مسح علی الخفین کی خبر، اور ایک ہی جنس کے دست بدست لین دین میں تفاضل کے حرام ہونے کی خبر۔ اور تیسری قسم وہ ہے جس کے منکر کے گناہ گار ہونے کا خطرہ تو نہیں ہے مگر اس کی رائے کو غلط ٹھیرایا جا سکتا ہے، اور اس قسم میں باب احکام کی وہ بہت سی خبریں داخل ہیں جن کے قبول اور رد کرنے میں فقہاء کے درمیان اختلافات ہیں" (جلد اول۔ صفحہ ۲۹۳)

اس بحث کو آپ غور سے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مدارِ کفر و ایمان اگر ہو سکتے ہیں تو صرف وہ امور ہو سکتے ہیں جو کسی یقینی ذریعۂ علم سے ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچے ہوں، اور وہ ذریعہ یا تو قرآن ہے یا پھر نقلِ متواتر جس کی شرائط امام سرخسی نے واضح طور پر بیان کر دی ہیں باقی جو چیزیں اخبار آحاد یا روایات مشہورہ سے نقل ہوئی ہوں وہ اپنی اپنی دلیل کی قوت کے مطابق اہمیت رکھتی ہیں، مگر ان میں سے کسی کی بھی یہ اہمیت نہیں ہے کہ اسے ایمانیات میں داخل کر دیا جائے اور اس کے نہ ماننے والے کو کافر ٹھیرایا جائے۔ مہدی کے متعلق جو روایات احادیث میں آئی ہیں ان کو اگر محدثانہ طریق پر جانچا جائے تو ان کا وہ مرتبہ بھی نہیں ٹھیرتا جو مسح علی الخفین اور ربوا الفضل کی روایات کا ہے۔

(۱۱) آپ کا یہ اعتراض میرے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ترجمان القرآن ماہ نومبر ۱۹۵۵ء میں میری وہ بحث پوری طرح پڑھنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی جس پر آپ اعتراض فرما رہے ہیں۔ بخاری کی جس حدیث کا آپ ذکر کر رہے ہیں اس کی تاویل

میں نے پوری وضاحت کے ساتھ اپنے فقرہ نمبر ۶ میں کی ہے جو مذکورۂ بالا رسالے میں صفحہ ۵۸
۵۹ پر درج ہے۔ اسے پڑھ کر دیکھیے، پھر بتائیے کہ اس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے
جو آپ نے کیا ہے؟ رہا فاروق اعظم کی تقریر کا معاملہ تو اس پر میں نے خود اپنی طرف سے
ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔ ہدایہ کے مشہور شارح علامہ ابن ہمام کی جو عبارت مشہور مفسر قرآن
علامہ آلوسی نے روح المعانی میں نقل کی تھی اس کا صرف ترجمہ کر دیا ہے۔ لیکن آپ کے نزدیک قصوروار
پھر بھی میں ہی رہا، ان دونوں بزرگوں کو خطاب کر کے آپ نے کچھ نہ فرمایا۔ اس سلسلہ میں آپ کے
مزید اطمینان کے لیے عرض کرتا ہوں کہ اسی خطبے میں حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ والرجم فی
کتاب اللہ حق علی من زنی اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینۃ
او کان الحبل او الاعتراف " کتاب اللہ میں رجم حق ہے اس مرد و عورت پر جو احصان کے بعد
زنا کرے جب کہ اس پر یا تو شہادت قائم ہو جائے، یا حمل پایا جائے یا وہ خود اعتراف کرے"۔ اس
خطبے کا یہ ٹکڑا کہ حمل بجائے خود سزائے رجم کے لیے کافی ثبوت ہے، جمہور فقہاء نے تسلیم نہیں کیا
ہے۔ علامہ شوکانی نیل الاوطار میں اس کے متعلق لکھتے ہیں :-

"جمہور اس طرف گئے ہیں کہ مجرد حمل سے حد ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے یا تو شہادتِ زنا
ہونی ضروری ہے یا پھر اعتراف۔ اور اس رائے کے حق میں وہ ان احادیث سے استدلال
کرتے ہیں جو شبہات میں حد جاری کرنے سے منع کرتی ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کا
قول ہے اور اس کی دلیل پر اتنا بڑا حکم ثابت نہیں ہو سکتا جو ہلاکِ نفوس تک نوبت پہنچاتا ہو۔
رہی یہ بات کہ حضرت عمر نے یہ مسئلہ صحابۂ کرام کے مجمع میں بیان کیا تھا اور اس پر کسی نے
انکار نہ کیا، تو یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ سامعین کے انکار نہ کرنے سے اجماع لازم
نہیں آتا۔" (ج ۷، صفحہ ۸۸)

(۱۲) آپ کا یہ اعتراض در اصل اعتراض نہیں بلکہ صریح بہتان ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات بھی
آپ نے میری اصل تحریر پڑھے بغیر محض سنی سنائی تہمتوں پر یقین کر کے اپنے اعتراض نامے میں درج

کردی۔ حضرت صدیقؓ کی بندشِ کفالتِ مسطحؓ کا قصہ ربیع الثانی ۷۵ھ کے ترجمان میں جس کا آپ حوالہ دے رہے ہیں، سرے سے درج ہی نہیں ہے۔ اس کا ذکر جمادی الاولیٰ ۷۵ھ کے ترجمان میں آیا ہے اور اس کے اندر میں نے کہیں اشارۃً و کنایۃً بھی یہ بات نہیں لکھی ہے کہ حضرت صدیقؓ کا یہ فعل غیر اسلامی حمیت پر مبنی تھا۔ آپ مذکورۂ بالا رسالے میں صفحہ ۲۰۷ کی پوری عبارت پڑھ کر بتائیں کہ یہ بات کہاں لکھی گئی ہے؟ پھر اس میں یہ کہاں لکھا گیا ہے کہ اس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عتاب ہوا اور وعید فرمائی گئی؟

اسی اعتراض کے سلسلے میں آپ ربیع الاوّل ۷۵ھ کے ترجمان کا حوالہ دے کر ایک اور عبارت کا ذکر فرماتے ہیں جو حضرت عمرؓ سے متعلق ہے، مگر ربیع الاوّل کا ترجمان اس قسم کے ہر لفظ سے خالی ہے۔ براہ کرم آپ پھر پڑھ کر بتایئے کہ یہ عبارت میری کس تحریر میں آپ کو ملی ہے۔ آپ تو صحابۂ کرام کی محبت کا ذکر فرماتے ہیں، مگر میرا خیال یہ ہے کہ سب سے پہلے آدمی کے دل میں خدا کا خوف ہونا چاہیے۔

(۱۳) میں نے کبھی نہ اپنے آپ کو معصوم عن الخطا سمجھا نہ کہا۔ میں نہ صرف اپنے اوپر اور اپنی ہر بات پر تنقید کو جائز سمجھتا ہوں بلکہ خود اس کی دعوت دیتا ہوں اور اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ آپ میری ہی نہیں جماعتِ اسلامی کے کسی شخص کی بھی کسی عبارت کا ایک لفظ اس الزام کے ثبوت میں پیش نہیں کر سکتے کہ ہم اسلام کی تعبیر کا حق صرف اپنے لیے مخصوص کرتے ہیں، یا اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر آپ برا نہ مانیں، تو میں صاف کہوں کہ آپ نے اس نمبر میں جو کچھ لکھا ہے وہ سراسر تعصب کی بنا پر لکھا ہے۔ جو حضرات میرے اوپر طرح طرح کے بہتان لگاتے ہیں، میری عبارتوں کو توڑ مروڑ کر ان کو غلط معنی پہناتے ہیں، اور بدترین قسم کے جھوٹے الزامات لگا کر نہ صرف تضلیل و تکفیر کے فتوے جڑتے ہیں بلکہ جگہ جگہ تقریروں اور اشتہاروں کے ذریعہ سے میرے خلاف عوام کو بھڑکاتے بھی پھرتے ہیں، وہ تو آپ کے نزدیک صرف "تنقید" کرنے والے ہیں اور ان کا یہ فعل کسی درجے میں بھی آپ کو قابلِ اعتراض یا قابلِ شکایت نظر نہیں آتا۔ البتہ ہزاروں زیادتیوں

صبر کرنے کے بعد اگر کبھی جماعت اسلامی کے کسی شخص کی زبان و قلم سے کوئی ایک لفظ ان کی تردید میں نکل جاتا ہے تو وہ آپ کو طعن نظر آتا ہے اور اس کی آپ شکایت فرماتے ہیں۔

(۱۴) تنقید کا لفظ جس معنی میں آپ نے اپنے اعتراض نمبر ۱۳ میں استعمال فرمایا ہے اُس معنی میں تو صحابۂ کرام کجا، کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کے انسان پر بھی تنقید کرنا میرے نزدیک سخت گناہ ہے۔ البتہ تنقید کے جو معنی اہل علم میں معلوم و معروف ہیں ان میں اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام کے سوا کسی انسان کو بھی میں تنقید سے بالاتر نہیں مانتا۔ کسی صحابی کا قول یا فعل بھی محض اپنے قائل و فاعل کی شخصیت کی بنا پر حجت نہیں ہے بلکہ اس کی دلیل دیکھ کر رائے قائم کی جائے گی کہ آیا اسے قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ دلیل کے لحاظ سے کسی بات کو جانچنے کا نام ہی تنقید ہے اور یہ تنقید مجھے نہیں معلوم کہ کس زمانے میں ناجائز رہی ہے۔ فقہ کے بکثرت مسائل میں مختلف صحابہ کے مختلف قولی اور عملی آثار پائے جاتے ہیں، اور ہم دیکھتے ہیں کہ تابعین اور تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین نے دلیل کی بنا پر ان میں سے کسی کو قبول اور کسی کو رد کیا ہے۔ آپ فقہ کی مبسوط کتابوں میں سے جس کو چاہیں اٹھا کر دیکھ لیں، آپ کو اس تنقید کی ہزاروں مثالیں مل جائیں گی۔ کیا وہ سب لوگ آپ کے نزدیک گناہ گار تھے جنھوں نے صحابہ کے مختلف اقوال و افعال میں اس طرح تنقیدی محاکمہ کیا؟ صحابی کالنجوم والی حدیث کا اگر آپ نے یہ مطلب لیا ہے کہ ہر صحابی کا ہر قول و فعل واجب الاتباع ہے تو سلف و خلف میں کوئی صاحب علم بھی مجھ کو اس کا قائل نہیں ملا۔ آپ کو ملا ہو تو اس کا نام مجھے بھی بتائیں۔ البتہ ساری امت اپنے دین کے ہر مسئلے میں بہر حال کسی نہ کسی صحابی کے ذریعہ ہی سے رہنمائی حاصل کرتی رہی ہے اور یہی اس حدیث کا منشا ہے۔